جدید علم کلام کا فروغ

ایران اور پاکستان

ثاقب اکبر

اس مضمون میں برصغیر پاک وھند اور ایران میں سامنے آنے والے کلامی رجحانات کو موضوع بنایا گیا ھے اور یہ بتایا گیا ھے کہ علمی حلقوں نے ان پر کس ردِ عمل کا اظہار کیا ھے۔ مصنف کا خیال ھے کہ ان رجحانات پر روایتی دینی طبقے کا ردِ عمل فی الجملہ منفی رھا۔

ایران میں جدید علم کلام پر بہت کام ہو رہا ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ ایران میں اسلامی حکومت کو درپیش نہایت سنجیدہ چیلنجز اور ایرانی حکومت کی طرف سے ان چیلنجز سے علمی طور پر نمٹنے کا عزم ہے۔ اس موضوع کو زیادہ شرح وبسط سے استاد مرتضیٰ مطہری (م ۱۹۷۹) نے اٹھایا ہے۔ اُن کے معاصرین اور اُن سے قبل کے بعض اہل علم نے بھی جدید کلامی روش کو اختیار کیا ہے۔ تاہم کلام جدید کے معاصر ایرانی اساتذہ کا کہنا ہے کہ یہ اصطلاح سب سے پہلے ایران میں استاد مطہری نے ہی استعمال کی ہے۔ (۱)

اسی طرح پاکستان وہند میں اس حوالے سے نظر ڈالی جائے تو سرسید احمد خاں (۱۸۹۸-۱۸۱۷) وہ پہلے مردِ کلام دکھائی دیتے ہیں جنھوں نے اس کی ضرورت کا ادراک کیا اور واضح طور پر اعلان کیا کہ ''اس نئی صورت حال میں جب کہ پرانے علوم مسترد ہو چکے ہیں اور ان کی جگہ نئے علوم لے چکے ہیں، اس بات کی ضرورت پیدا ہوئی ہے کہ ایک نیا علم کلام مرتب کیا جائے۔ جس سے یا تو ہم علوم جدید کے مسائل کو باطل کر دیں یا ان کو مشتبہ کر دیں یا اسلامی مسائل کو ان کے مطابق کر دکھائیں'' (۲) پھر اس حوالے سے انھوں نے تازہ افکار بھی پیش کیے۔ البتہ بعض معاصر ایرانی دانشوروں کو اشتباہ ہوا ہے کہ ''کلام جدید'' کے پیش رو شبلی نعمانی (م ۱۹۱۶) ہیں (۳)۔ یہ اشتباہ شاید ان کی کتاب ''علم الکلام'' سے پیدا ہوا ہے۔ انھیں تو بعض دانشوروں نے ''سرسید کا پرتو'' (۴) قرار دیا ہے۔ تاہم قاضی جاوید بجا کہتے ہیں:

> بایں ہمہ یہ امر واقعہ ہے کہ سید احمد خان اور شبلی نعمانی کے رویوں میں اساسی اختلافات موجود تھے اور یہ کہ انھوں نے جن مکاتب فکر کی بنا ڈالی وقت کے ساتھ ساتھ ان میں دوری بڑھتی گئی (۵)۔

اس سلسلے میں اہل تشیع میں سے مولوی چراغ علی (۱۸۹۵-۱۸۴۴) اور سید امیر علی (م ۱۹۲۸) کا نام لیا جا سکتا ہے۔ تاہم کیا ایسے افراد جو روایت شکنی کے بعد فکر ونظر کی تازہ دنیا آباد کرتے ہیں انہیں شیعہ وسنی کے روایتی حصار میں قید رکھا جا سکتا ہے یا نہیں، یہ سوال اپنی جگہ پر نہایت اہم ہے۔ جہاں تک محمد ابن عبدالوہاب کی تحریک کا تعلق ہے رفتہ رفتہ ظاہریت میں تبدیل ہو گئی ہے۔ اس تحریک کے لئے علامہ اقبالؒ (۱۹۳۸-۱۸۷۶) نے بھی اجتہاد کے بارے میں اپنے معرکۃ الآرا خطبے میں کچھ ایسی ہی رائے کا اظہار کیا تھا (۶)۔ خود اقبال کی کلام جدید میں خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ بعض دانشوروں کی رائے میں وہ فلسفی نہیں بلکہ متکلم ہیں۔ البتہ راقم کی رائے میں کلام جدید میں کارفرما فلسفی بنیادوں کو پیش نظر رکھیں تو پھر کسی فلسفی کا عصر حاضر میں متکلم ہونا عیب نہیں بلکہ ہنر بن جاتا ہے۔ کلام جدید کے بعض اہم دانشور بنیادی طور پر فلسفی ہی ہیں۔ مولانا قمر الزمان سبزواری (م ۱۹۶۰ء) کی ایک مختصر کتاب ''راز قدرت'' میری نظروں سے گزری تھی جس نے مجھے حیران کر دیا تھا، افکار سے

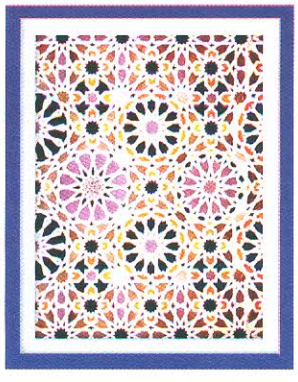

زیادہ باعث حیرت اُن کی گم ہوجانے والی شخصیت پر ہے۔ اہل علم میں ان کے افکار کی بازگشت مجھے کہیں سنائی نہیں دی۔ شیعوں میں ابن حسن جارچوی بھی کچھ مختلف آدمی تھے۔ اُن کے خطبات کی کتاب ''فلسفہ آل محمدؐ'' (۷) اس پر شاہد ہے۔ یہ فلسفے کی کتاب نہیں بلکہ جارچوی صاحب کے مذہبی افکار کی توجیہ نو ہے۔ اسے اُن کے مذہب کی عصری تاویل بھی کہا جاسکتا ہے۔ اہل حدیث خاندانوں کے بعض علماء نے بھی کلام جدید کی وادی میں قدم رکھا اور خوب دادِ سخن دی ہے۔ ان میں سے مولانا جعفر شاہ پھلواروی (۱۹۸۲-۱۹۰۲) شاید پہلے نمبر پر ہیں۔ مولانا محمد حنیف ندوی (۱۹۸۷-۱۹۰۸) کا نام بھی اس فہرست میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ کلامِ جدید کے شہسواروں کے ناقدین کی بھی کمی نہیں۔ سب سے زیادہ گالیاں سرسید کے حصے میں آئی ہیں اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے (۸)۔

افکار کے ردّ وقبول کے بارے میں ہمارے رویے افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ جو شخص دلیل کے ساتھ اپنی بات پیش کرتا ہے وہ حق رکھتا ہے کہ اس کی بات کو قبول کرلیا جائے یا دلیل کے ساتھ ردّ کردیا جائے۔ نظریے کا کلی ردوقبول ہو یا جزئی، یہی راستہ درست معلوم ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو الزامات عائد کرنے لگتے ہیں اور کردار کشی پر اُتر آتے ہیں، وہ غیر علمی راستہ اختیار کرتے ہیں۔ ایسے لوگ افراد اور معاشرے کے مابین بدگمانی اور نفرت کی دیوار کھڑی کردیتے ہیں۔ یہ لوگ دراصل معاشرے کے فکری ارتقا میں حائل ہوجاتے ہیں اور جمود کا باعث بنتے ہیں۔ افراد سے گزر کر یہ رویے قوموں کی ذہنیت میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ وہ قومیں جو نئی بات سننے اور سمجھنے کے لئے تیار نہ ہوں فکری جمود کا شکار رہتی ہیں اور فکری جمود ہی علمی جمود کا ذریعہ بنتا ہے۔ علامہ اقبال قوموں کے فکری جمود ہی کا گلہ یوں کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں:

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں (۹)

یہاں معاملہ کسی فکر کے درست و نادرست یا صالح وغیر صالح کا نہیں فقط کسی فکر کے بارے میں ردعمل کے طریقے کا ہے۔ رائے سرسید کی ہو یا علامہ اقبال کی، امام خمینی کی ہو یا استاد مصطفیٰ ملکیان (۱۰) کی اسے سوچنے والے ایک انسان کی رائے کے طور پر سامنے آنا چاہیے۔ اسے قبول یا رد کرنے کے لئے دلیل واستدلال کے مرحلے سے گزرنا چاہیے۔ کسی کو سامراج کا ایجنٹ کہنا، کسی کو منحرف کہنا، کسی کی تکفیر کرنا اور کسی کو محرف قرآن قرار دینا، یہ رویہ درست نہیں۔ اگر یہ رویہ نہ ہوتو ہم اپنے مفکرین سے اس سے کہیں زیادہ مستفید ہوسکتے ہیں جتنا استفادہ بالعموم اُن کی زندگی میں یا بعد میں ہو پاتا ہے۔ اگر منفی ردعمل کا اور کردار کشی کا اندیشہ نہ ہوتو اہل فکر زیادہ وضاحت سے اور کھل کر اپنی بات کرسکتے ہیں۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ سرسید نے وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو انھوں نے سوچا لیکن علامہ اقبال نہیں کہہ پائے۔ اگرچہ ''بڑے دماغ'' علامت واستعارہ اور ابہام کا سہارا لے کر بہت کچھ کہہ دیتے ہیں۔ تاہم ''متشابہات'' کے پیچھے پڑے رہنے والوں کے لئے اسی میں سرمایۂ عمل موجود ہوتا ہے۔ امام خمینی کو بھی موقع مل گیا اور انھوں نے بہت کچھ بیان کردیا لیکن سب کو ایسے مواقع میسر نہیں آتے۔ خود امام خمینی نے ایک مقام پر بیان کیا ہے کہ جب اُن کے بڑے صاحبزادے مرحوم مصطفیٰ خمینی (م ۱۹۷۸) ابھی چھوٹے تھے تو انہوں نے کسی مدرسے کے گلاس میں پانی پیا، مولوی صاحبان نے اس گلاس کو ''شرعی طریقے'' سے پاک کیا اور پھر استعمال کیا کیونکہ اُن کے خیال میں امام خمینی فلسفے کا درس دینے کی وجہ سے کافر تھے اور کافر کا بیٹا ''کافر کے حکم میں'' ہوتا ہے۔ اس لئے جب اُن کے خیال میں ''کافر'' نے کسی گلاس میں پانی پیا تو وہ نجس ہوگیا۔ یہ واقعہ امام خمینی نے اپنے معروف مکتوب ''منشورِ روحانیت'' میں بیان کیا ہے۔ اس میں جامد فکر علماء کے ایک طبقے کی طرف سے امام خمینی کو جتنا ستایا گیا اور جتنی اذیتیں دی گئیں اس کا بیان بڑے پرسوز انداز سے کیا گیا ہے۔

استاد مرتضیٰ مطہری

استاد مرتضیٰ مطہری جن پر آج حوزہ ہائے علمیہ بڑا ناز کرتے ہیں کہ وہ ان میں سے ہیں، کبھی حوزہ علمیہ کی تنگ فضا میں مجبور

ہوگئے تھے کہ شرح منظومہ (۱۱) کا عمومی درس بند کردیں۔ یہ درس پھر انھوں نے ایک بند حجرے میں کہنا شروع کیا جس میں اُن کے چار منتخب شاگرد شریک ہوتے تھے۔ اب اُن کی یہی شرح حوزہ ہائے علمیہ کے مفاخر کا حصہ بن گئی ہے۔

نجف اشرف میں امام باقر الصدر شہید (م ۱۹۸۰) کی، جو آج اس سرزمین کا سب سے زیادہ قابل افتخار نام ہیں، اس قدر کردار کشی کی گئی اور اتنے طعنے دیے گئے کہ انھیں اپنے اس وظیفے کا سلسلہ بند کرنا پڑا جو وہ نجف اشرف کے دینی طلبہ کو ''مرجع'' کی حیثیت سے دیتے تھے (۱۲)۔ اُن کا ایک قصور یہ بھی تھا کہ ''کم عمری'' میں مقامِ مرجعیت تک جا پہنچے تھے۔ آج اُن کی کتب حوزہ ہائے علمیہ کے نصاب میں شامل ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ فقط ہم عصری کا نہیں کہ جو کسی عظیم انسان کے لئے ایک حجاب بن جاتی ہے بلکہ حسد جیسی عظیم بیماریاں بھی سدّ راہ ہو جاتی ہیں۔

آیۃ اللہ سید محمد رضا گلپایگانی (م ۱۹۹۳) کے مدارس میں فلسفے کا درس کہنے پر پابندی تھی۔ کسی کو اجازت نہ تھی کہ وہاں فلسفے کا درس کہے۔ یہ سلسلہ اُن کی وفات کے بعد بھی جاری رہا۔ آیت اللہ اسد اللہ بیات جو ایران کی مجلس شوریٰ اسلامی کے ڈپٹی اسپیکر رہے تھے، جب سیاست سے کنارہ کش ہوئے تو حوزہ علمیہ قم میں پھر سے درس و تدریس میں مشغول ہوگئے۔ انھوں نے

جدید عقلیت پسندی کی مغربی روش ہویا مشرقی--- ضرورت اس امر کی ہے کہ لوگوں کو سوچنے اور اپنی رائے بیان کرنے کی آزادی ہو۔

آیت اللہ گلپایگانی مرحوم کے دارالقرآن میں فلسفے کی کتاب ''نہایہ'' کا درس کہنا شروع کیا تو اُن پر پابندی عائد کردی گئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آیت اللہ گلپایگانی نے امام خمینی کی نماز جنازہ پڑھائی۔

پاکستان میں بھی روایت سے مختلف بات کہنے والے اسی سلوک کے مستحق قرار پائے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر فضل الرحمٰن مرحوم (۱۹۸۸-۱۹۱۹) کی شدید مخالفت ہوئی۔ روایتی علماء نے انھیں آڑے ہاتھوں لیا کیونکہ وہ کچھ تازہ افکار کا اظہار کرتے تھے۔ فضا ان کے لئے ایسی تیرہ و تار ہوئی کہ وہ وطن چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔ مولانا مودودی (۱۹۷۹-۱۹۰۳) کو جدید و قدیم کے درمیان کی شخصیت کہا جاسکتا ہے۔ تاہم عقاید، فہم تاریخ اور احکام کے حوالے سے انھوں نے بعض باتیں رائج اور روایتی فکر سے ہٹ کر کی ہیں۔ اس پر ان کی ذات پر شدید حملے ہوئے۔ بعض نے تو ابھی تک انھیں معاف نہیں کیا۔ ان کی کچھ جماعتی اور سیاسی مشکلات بھی تھیں جن کی وجہ سے وہ بہت کچھ کھل کر نہ کہہ سکے۔ وہ بہت سے مقامات پر ضرورت سے زیادہ محتاط دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کی اس کیفیت کا ذکر ایک مقام پر اُن کے صاحبزادے حیدر فاروق مودودی نے بھی کیا ہے (۱۳)۔

جدید فکر کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ اگر وہ معاشرے میں قابل قبول سمجھی جائے تو انسانی فکر ایک مرحلہ تو آگے بڑھتی ہے لیکن

وہی ''جدید فکر'' پھر سے ''قدیم'' ہوجاتی ہے کیونکہ وہ معاشرے کے جامد فکر لوگوں کے ہاتھ آجاتی ہے۔ جامد فکر لوگ اُس کے وارث بن جاتے ہیں اور صاحبِ فکر کے مجاور بن جاتے ہیں۔ اس طرح وہ جدید فکر کو آگے بڑھنے سے روک دیتے ہیں۔ یہ ایسے فن کار ہوتے ہیں کہ علامہ اقبال ہی کا نام اُن کے خلاف استعمال کر لیتے ہیں، امام خمینی ہی کا نام اُن کے خلاف استعمال کر لیتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ ہر فکر جو ایک دور میں جدید ہو اپنے بعد والے دور میں بھی جدید قرار پائے۔ ضروری نہیں کہ امام شاطبی (۱۴) نے مقاصد شریعت کے جو عناصر بیان کیے ہیں انھیں حتمی قرار دے کر اُن کے گرد حصار قائم کر دیا جائے۔ جو لوگ اپنے دور میں بت شکن بن کر اٹھتے ہیں انہی کو بعد میں بُت بنا لیا جاتا ہے۔ نبیوں، اماموں، فلسفیوں، مفکروں، مصلحوں، سیاستدانوں، شاعروں اور ادیبوں سب کے ساتھ یہی ہاتھ ہوا ہے۔ جو بھی عظیم ثابت ہو گیا وہی بت بن گیا۔ اُن کی فکر، ان کی اصطلاحیں، اُن کا طرز استدلال بلکہ اُن کا لباس، اُن کا عمامہ اور اس سے بڑھ کر اُن کے لباس کے رنگ ہر چیز بت پرستی کے عناصر میں شامل ہوگئی۔

ایک مرتبہ حضرت علیؑ سے کسی نے کہا کہ داڑھی کو خضاب کرنا سنتِ رسولؐ ہے۔ آپ نے فرمایا یہ خضاب جنگ بدر میں اس لئے

استاد مرتضیٰ مطہری جن پر آج حوزہ ھائے علمیہ بڑا ناز کرتے ھیں کہ وہ ان میں سے ھیں، کبھی حوزہ علمیہ کی تنگ فضا میں مجبور ھوگئے تھے کہ شرح منظومہ کا عمومی درس بند کردیں۔

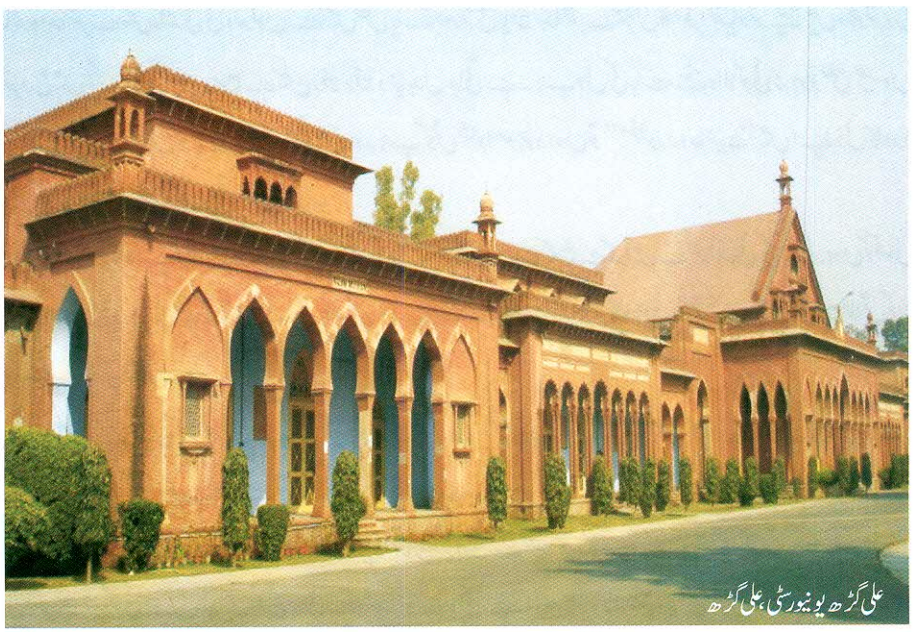
علی گڑھ یونیورسٹی، علی گڑھ

کیا گیا تھا کہ اسلامی فوج میں شامل بہت سے سفید ریش سپاہی تھے۔ نبی کریمؐ نے چاہا کے دشمن یہ نہ سمجھے کہ بوڑھے بوڑھے افراد مسلمانوں کی فوج میں شامل ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت علیؑ جمود ہی کو روکنا چاہتے تھے لیکن کیا کیجئے کہ جب علیؑ ہی کی پرستش ہونے لگے۔

افکار نو کی شاید سب سے بڑی مشکل مذہب و مقدسات کا اُن کے خلاف استعمال ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکنے کے لئے بتوں ہی کے تقدس کو بروئے کار لایا گیا۔ اس کے لئے عوام کے مذہبی جذبات کو بھڑکایا گیا۔ پوری انسانی سوسائٹی کو حرکت میں لایا گیا۔ لوگ جوش و خروش سے حضرت ابراہیمؑ کو جلانے کے لئے ایندھن اکٹھا کرنے لگے۔ سقراط کو زہر پلانے کے لئے بھی پراپیگنڈا کا بازار اس کے خلاف گرم کیا گیا۔ پیغمبر اسلامؐ کے خلاف تین سال سے زیادہ سماجی و اقتصادی بائیکاٹ رہا۔ شعب ابی طالب میں بنی ہاشم کے بھوکے پیاسے بچوں کے بلکنے کی آواز بھی قریش کی انسانی فطرت کو مخاطب نہ کر سکی تو اس کے پیچھے بتوں کے تقدس کا عقیدہ ہی کارفرما تھا۔ مخالفین کہتے تھے کہ محمدؐ ان کے آباؤ اجداد کے عقاید کی توہین کرتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کو پھانسی دینے کے لئے یہودی ملاؤں نے مذہب ہی کا ہتھیار استعمال کیا۔

ازمنہ وسطیٰ میں خود کلیسا نے بھی وہی رویہ اختیار کیا اور مخالف عقائد وافکار رکھنے والوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ بالکل یہی رویہ اب مغربی تہذیب کے علم برداروں کا ہے۔ جو کوئی بھی مغربی فہم کے کسی عنصر یا مغربی تہذیب کے کسی مظہر کا انکار کرتا ہے، اُسے انتہا پسندی اور بنیاد پرستی کے طعنوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ بعض ملکوں اور معاشروں میں مسلمان عورتوں کے حجاب کے خلاف کیے جانے والے ''شدت پسندانہ'' اقدامات اس کی مثال ہیں۔ سیکولرزم کا مطلب اگر یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے پر اپنا نظریہ، عقیدہ یا کلچر مسلط نہ کرے تو یہ حق سیکولرزم کے پرچم برداروں کو دوسروں کو بھی دینا چاہیے۔ اگر حجاب کو پسند کرنے والی عورت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنا حجاب دوسروں پر مسلط کرے تو حجاب کو پسند نہ کرنے والوں کو بھی حق نہیں پہنچتا کہ وہ زبردستی کسی کو بے حجاب کریں۔

جدید عقلیت پسندی کی مغربی روش ہو یا مشرقی۔۔۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ لوگوں کو سوچنے اور اپنی رائے بیان کرنے کی آزادی ہو۔ فکر کے درست یا نادرست ہونے سے قطع نظر سوچنے والوں کے افکار سامنے آنے چاہئیں۔ ہمیں دلیل مانگنے کا حق ہے۔ ردّ وقبول کا بھی حق ہے۔۔۔ البتہ وہ بھی دلیل کی بنیاد پر لیکن اگر تازہ سوچ کی اجازت نہ ملے تو پس ماندہ معاشرے پس ماندگی کی دلدلوں سے نہیں نکل پاتے اور ترقی یافتہ معاشرے تنزل کا سفر اختیار کر لیتے ہیں، جو شروع شروع میں اگرچہ غیر محسوس ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ دنیا بدل جاتی ہے۔ جب دل کی بات سننے والا کوئی نہ ہو تو علیؑ جیسوں کو کنویں میں منہ ڈال کر باتیں کرنا پڑتی ہیں اور جب گوش شنوا موجود ہوں تو ''منشور روحانیت'' میں اپنے دل کا درد بیان کرنے میں کوئی مشکل باقی نہیں رہتی۔

تاہم اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اُسے دانائی یا حکمت میں سے کچھ حصہ ملا ہے، جو سمجھتا ہے کہ اُس نے فکر انسانی کی کچھ گرہوں کو کھول لیا ہے اور کسی کی رائے ہے کہ اُس کے پاس انسان کو دینے کے لئے کوئی تازہ خیال موجود ہے تو اُسے کہنے کا راستہ تلاش کرنا چاہیے۔ بقول اقبال:

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے، پا بہ گل بھی ہے　　انہیں پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے (۱۵)

یعنی جسے اپنی سچائی پر بھروسہ ہے اُسے سچ کہنے کا ہنر بھی آنا چاہیے۔

میں نہیں سمجھتا کہ دنیا اس لحاظ سے بدل گئی ہے کہ اب انسان آزادی سے بغیر کسی رکاوٹ کے اپنی فکر کا اظہار کر سکتا ہے۔ انسان کی فطرت میں کوئی جوہری تبدیلی واقع ہوئی ہے اور نہ ہونے والی ہے۔ افکار تازہ کا استقبال اسی طرح ہوتا رہے گا۔ کبھی جمود کی دیوار سے سر ٹکرانا ہوگا اور کبھی جہالت وغفلت کی آندھیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ امیر المومنین علیؑ نے فرمایا تھا:

الناس اعداء ما جهلوا (۱۶)

انسان جس چیز سے جاہل ہوتے ہیں اس کے دشمن بن جاتے ہیں۔

یہ ان کا تجربہ بھی تھا اور انسان کی شناخت بھی۔ انسان کو پہلے مرحلے میں ہر چیز کی کھال ہی دکھائی دیتی ہے۔ کھال کے اندر کیا ہے اور کیسا ہے، یہ جاننے کی نوبت بعد میں آتی ہے۔ حاضر وموجود اور ظاہر وباہر پر نگاہوں کے ٹک جانے اور ٹھہر جانے کی شکایت تو رہے گی لیکن یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ ارتقا کا عمل جاری رہتا ہے۔ اکثر یہ عمل سست رفتار ہوتا ہے۔ کبھی برعکس سفر بھی شروع ہو جاتا ہے لیکن پھر کوئی جنبش واقع ہوتی ہے، اچانک ایک ابھار آتا ہے تو تنزل کی تلافی کر کے انسانی فکر کو کچھ آگے لے جاتا ہے۔ طاقتور دماغ کے ساتھ جب طاقتور روح ظہور کرتی ہے تو انسانی معاشرہ اور انسانی فکر ضرور ایک مرحلۂ بالا تک پرواز کرتی ہے۔ گاہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ صدیوں بعد کسی انسان کی فکر کا پودا پھوٹ پڑتا ہے۔ بیج ضرور ڈالنا چاہیے۔ اپنے حصے کا چراغ ضرور جلانا چاہیے۔ نتیجہ کیا نکلتا ہے، یہ ہماری ذمہ داری نہیں۔

ثاقب اکبر، مصنف، مترجم اور تحقیقی ادارے البصیرہ اسلام آباد کے ڈائریکٹر ہیں

مصادر وحواشی

۱- جعفر سبحانی: مدخل کلام جدید در علم کلام، قم (ایران): موسسہ امام صادقؑ، ۱۳۷۵ھ ش، ص ۱۰

۲- سرسید احمد خان کا سفر نامہ پنجاب، ص ۲۶۹، مرتبہ مولوی سید اقبال علی

۳- جعفر سبحانی: مدخل کلام جدید در علم کلام، قم (ایران): موسسہ امام صادقؑ، ۱۳۷۵ھ ش، ص ۱۰

۴- ڈاکٹر ابواللیث نے اپنی یہ رائے ڈاکٹر آفتاب احمد کی کتاب ''شبلی۔ایک دبستان'' کے مقدمے میں تحریر کی ہے۔

۵- قاضی جاوید: سرسید سے اقبال تک، نگارشات، لاہور (۱۹۸۹ء) ص ۱۲۹

۶- علامہ اقبال کہتے ہیں:

''بہر حال جہاں تک تحریک وہابیت کا تعلق ہے ہمیں اس سے بحث نہیں کہ محمد علی پاشا (والی مصر) کے عسا کر نے کب اور کس طرح اس کا خاتمہ کیا۔ یہاں بحث آزادی اجتہاد کی اس روح سے ہے جو اس تحریک میں کام کر رہی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ داخلی طور پر اس کا مزاج بھی سرتا سر قدامت پسند تھا۔ اس نے مذاہب اربعہ کی قطعیت سے انکار کیا اور اس لیے آزادی اجتہاد کے حق پر بھی بڑے شدومد سے زور دیا، لیکن ماضی کے بارے میں چونکہ اس کا نقطہ نظر سرتا سر غیر تنقیدی رہا، لہٰذا امور قانون میں اس کا اپنا دارومدار صرف احادیث پر رکھا۔''

(تشکیل جدید الٰہیات، خطبہ الاجتہاد فی الاسلام، ترجمہ نذیر نیازی)

۷- آخری مرتبہ یہ کتاب رحمت اللہ بک ایجنسی کراچی نے ۱۹۹۹ء میں شائع کی ہے۔

۸- ابھی حال ہی میں سرسید احمد خان کے خلاف ''محرف قرآن'' کے نام سے مولانا عبدالقیوم حقانی کی ایک کتاب منظر عام پر آئی ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ کتاب سرسید کو ''محرف قرآن'' ثابت کرنے کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس کے ٹائٹیل پر لکھا ہے ''سرسید احمد خان، اپنی تحریرات فاسدہ اور عقائد کاسدہ کے آئینہ میں'' کتاب ادارۃ العلم والتحقیق، نوشہرہ نے شائع کی ہے۔

۹- بانگ درا، نظم: بزم انجم

۱۰- استاد مصطفیٰ ملکیان عصر حاضر کے علم کلام جدید کے نامور دانشوروں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ تہران یونیورسٹی کے شعبہ الٰہیات سے وابستہ رہے ہیں۔

۱۱- شرح منظومہ عظیم فیلسوف ملا ہادی سبزواری کی کتاب ہے۔

۱۲- مرجع اس فقیہ کو کہتے ہیں جس کی طرف عامۃ الناس مسائل شرعی میں تقلید کے لیے رجوع کرنے لگیں۔

۱۳- اسے راقم نے اپنی کتاب ''جماعت اسلامی پاکستان، ایک حاصل مطالعہ'' میں نقل کیا ہے۔ (ص۔۴۰)

۱۴- ابراہیم شاطبی، آٹھویں صدی ہجری کے معروف اور جرات مند مالکی فقیہ

۱۵- بانگِ درا، نظم: پھول

۱۶- نہج البلاغہ، حصہ سوم، کلمہ: ۱۷۲

علم کا موضوع

علم کا موضوع وجود ہے جو صرف ادراک حقیقت کا نام ہے اور عمل کا موضوع کمال ہے جو حصول مقصد سے وابستہ ہے، علم کا مسئلہ یہ ہے کہ وجود کیا ہے؟ اور عمل کا مسئلہ یہ ہے کہ کمال کیسے حاصل ہو؟ علم کا محرک موضوع کی نسبت شک ہے، عمل کا محرک مقصد کی نسبت یقین ہے، علم سے پہلے لاعلمی ہے اور عمل سے پہلے ایمان ہے کہ مقصود حاصل ہوگا۔ علم کا نتیجہ ادراک حقیقت ہے، عمل کا نتیجہ حصول مقصود ہے۔ علم کے لیے جبر ضروری ہے یعنی علت و معلوم کا تعلق اور عمل کے لیے اختیار ناگزیر ہے، تفسیر علم کے لیے ہے قرآن عمل کے لیے۔ تفسیری علوم کا موضوع قرآن ہے، علوم علوم ہی رہیں گے محرک عمل نہیں بن سکتے، قرآن کا موضوع غایت نزول کا حصول ہے۔

(قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل..... برہان الدین احمد فاروقی)